عطاء اللہ پالوی

قطع ید

مندرجہ ذیل مضمون ہم اس لیے شائع کر رہے ہیں کہ اہل نظر دیکھ لیں،

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

فاضل مقالہ نگار یہ بھول گئے کہ ایک چیز ہے لغوی تحقیق اور نکتہ سنجی دوسری چیز ہے، عمل اور عمل متواتر، جہاں الفاظ کا ہیر پھیر کام نہیں دیتا۔ کیا قطع ید صرف ایک نظریہ ہے یا اس پر باقاعدہ عمل بھی ہو چکا ہے؟

قارئین ثقافت میں سے اگر کوئی صاحب اس موضوع پر لکھیں تو ہم خوشی سے چھاپیں گے ورنہ ہم بھی تاریخ اور حقائق کی روشنی میں اس پر تبصرہ کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ (مدیر)

قرآن نے کبائر گناہ و جرائم اور ان کی سزاؤں کا خود تعین کر دیا ہے۔ جہاں تک "چوری" کا تعلق ہے از روئے قرآن یہ کوئی سنگین جرم نہیں۔ کیونکہ یہ جرم ہر نوع اور ہر قیمت کا ہر انسان سے ہر جگہ مختلف اسباب و حالات کی بنا پر واقع ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ "چوری" جس فعل کو قرار دیا جائے وہ بالکل بے حقیقت ہو یا ہر گز نہ ہو۔ خود قرآن شاہد ہے کہ غلہ ناپنے کا پیمانہ چرانے والے کو بھی عمال مصر نے "چور" کہا تھا۔

انکم لسارقون (۱۲/۷۰) تم لوگ ضرور چور ہو

حالانکہ غلہ ناپنے کا پیمانہ ایک بالکل بے حقیقت اور غیر اہم و ادنیٰ شے ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کے کنوئیں سے نکل بھاگنے کو بھی "چوری" سے تعبیر کیا تھا:

ان یسرق فقد سرق اخ لہ من قبل (۱۲/۷۷)

اگر بنیامین نے چوری کی ہے تو اس کا ایک بھائی بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی سے چوری سے نکل بھاگنے کو "سرقہ" سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ بھی "چوری" میں شمار کیا گیا اور کیا جاتا ہے۔

دوسری جانب ایمان کا لازمی نتیجہ عمل ہے اور اسی عمل پر گرفت و نجات کا قانون بنا ہے:

وکل انسان الزمنہ فی عنقہ ونخرج لہ یوم القیمۃ کتباً یلقہ منشورا ۵ (۱۷/۱۳)

اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا نامۂ اعمال اس کے واسطے نکال کر سامنے کر دیں گے جس کو وہ کھلا اور کھلا دیکھ لے گا۔

اور سارے انسانی اعمال و وظائف حیات کا انحصار "ہاتھ" اور حرف "ہاتھ" پر ہے۔

بنی اسرائیل کے ذکر میں آیا ہے کہ:

ولن یتمنوہ ابداً بما قدمت ایدیھم (۲/۹۵)

وہ کبھی موت کی تمنا نہیں کر سکتے۔ بوجہ ان اعمال کے جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے سمیٹے ہیں۔

اسی لیے قیامت کے دن نامۂ اعمال لوگوں کے ہاتھوں ہی میں دیا جائے گا:

۔کل امۃ تدعیٰ الی کتبھا الیوم تجزون ما کنتم تعملون (۴۵/۲۸)

ہر جماعت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی کہ آج وہ دن ہے جب کہ تمہارے اعمال کا تم کو صلہ ملے گا۔

۲۔ فمن اوتی کتبہ بیمینہ فاولئک یقرؤن کتبھم ولا یظلمون فتیلاً (۴/۷۱)

سو جس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ اس کو پڑھیں گے اور ان کا ذرہ برابر بھی نقصان نہ کیا جائے گا۔

اور اسی لیے قیامت کے دن ہاتھوں کی شہادت لی جائے گی:

تکلمنا ایدیھم (۳۶/۶۵) ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے۔

غرض جسم انسانی میں "ہاتھ" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کیونکہ وہ تمام اعمال کا ذریعہ ہے۔ اب اس عظیم نعمت اور سب سے اہم حصۂ جسم سے کسی انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دینا اور وہ بھی گناہ صغیرہ یا معمولی جرم پر بجائے خود ایک انتہائی ظالمانہ فعل اور سنگین جرم ہے۔ چور اگر ایک وقت میں اس ہاتھ سے چوری کرتا ہے تو دوسرے وقتوں میں اسی ہاتھ سے اپنی روزی بھی حاصل کرتا ہے۔ کما کے اپنے والدین، آل اولاد اور عزیز و اقربا کی پرورش بھی کرتا ہے۔ اسی سے وضو و غسل کر کے نماز بھی پڑھتا ہے۔ مسجدوں کی خدمت بھی کرتا ہے۔ بیماروں کو سہارا اور مجبوروں کو مدد بھی دیتا ہے۔ جہاد میں شرکت اور مظلوموں کی دستگیری بھی کرتا ہے۔

اسی طرح وہ عورت اپنے والدین، شوہر اور بال بچوں کی خدمت، بیماروں کی تیمارداری اور جہاد میں زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کرتی ہے۔ پھر کیا ایک معمولی عمل بد یعنی چوری کرنے کی سزا میں اس کا ہاتھ کاٹ کر اس کو متذکرہ بالا تمام صالح وظائف اور اعمال حسنہ سے مرتے دم تک کے لیے محروم کر دینا کوئی عقلی انصاف یا دینی عدل متصور ہو گا؟

اگر چور کا ہاتھ کاٹنا اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ پھر آئندہ چوری نہ کر سکے تو زانیوں کی سزا ان کو خصی کرنا ہی مقرر کرنا ہو گا تاکہ وہ آئندہ ایسا ناپاک و سنگین اور دینی، اخلاقی اور سماجی جرم نہ کر سکیں۔ اور جھوٹ بولنے والوں یا جھوٹی سزا دینے والوں کی زبان ہی کاٹنی پڑے گی تاکہ وہ پھر ایسا نہ کر سکیں کیونکہ چوری بر حالی زنا اور کذب سے زیادہ سنگین جرم نہیں ہے۔

درحقیقت ہاتھ کاٹنا بقول قرآن وہ ظالمانہ فعل ہے جس پر فرعون عامل تھا اور فرعون کی تقلید بہرحال ناپسندیدہ فعل ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ غالباً اس سلسلے میں سورۂ مائدہ کی اس آیت کا سہارا لیا گیا ہے جس میں 'سارق' اور 'سارقہ' کی سزا "قطع ید" بتائی گئی ہے جو یوں وارد ہے:

والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما جزاء بما کسبا نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم ۝ فمن تاب من بعد ظلمہ و اصلح فان اللہ یتوب علیہ ان اللہ غفور رحیم (۵/۳۸-۳۹)

اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے تو ان کا قطع ید کرو۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے اللہ کی طرف سے بطور ایک روک کے۔ اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ہاں جو شخص توبہ کرے اس حرکت کے بعد اور اپنی اصلاح کرے تو بے شک اللہ اس کی طرف توجہ کرے گا واقعی اللہ غفور رحیم ہے۔

ان آیات میں "قطع ید" سے واقعی "ہاتھ کاٹنا" مراد لینا نہ صرف قرآن فہمی سے کوسوں دوری ہی کی علامت ہے بلکہ قرآنی الفاظ اور قانونی انداز سے مطلقاً بے خبری کی بھی دلیل ہے۔ اگر واقعی اللہ تعالیٰ کا مقصود "قطع ید" سے ہاتھ کاٹ ڈالنا ہوتا تو وہیں پر اس سلسلے کی ضروری وضاحتیں بھی کر دیتا، مثلاً:

۱۔ "چوری" کس فعل کو قرار دیا جائے گا اور چور کون متصور ہوگا؟

۲۔ ہاتھ کی تعریف کیا ہوگی؟ کیونکہ انگلیوں سے مونڈھے تک ہاتھ کہلاتا ہے۔

۳۔ ہاتھ کاٹا جائے گا تو کون سا؟ اور کہاں سے؟

۴۔ پہلے کون سا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ اور دوسری چوری میں کیا سزا دی جائے گی؟

۵۔ اگر دونوں دو چوریوں میں کاٹ دیے جائیں گے تو تیسری اور چوتھی چوری میں کیا سزا دی جائے گی؟ کیونکہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر پھر چوری کر سکتا ہے؟

۶۔ دونوں ہاتھوں سے بے کار ہو جانے پر اس کی یا اس کے وابستگان کے رزق کا کیا انتظام ہو گا؟

چونکہ یہ اہم اور بے حد ضروری وضاحتیں یہاں موجود نہیں لہذا "قطع ید" کا مطلب یہاں ہاتھ کاٹنا ہو ہی نہیں سکتا اور ہرگز نہیں ہے۔ جس اللہ نے وضو میں ہاتھ دھونے کا حکم دیا تھا اس نے وہیں پر "الی المرافق" کہہ کے بتا دیا تھا کہ ہاتھ کہاں تک دھویا جائے گا۔ حالانکہ اگر وضو میں محض گٹوں تک یا پھر مونڈھوں تک بھی ہاتھ دھو لیا جاتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا "غسل ید" ہو جاتا لہذا اس کی تخصیص ضروری نہ تھی۔ مگر چونکہ قانون، قانون ہے اور اس کی ہر بات متعین ہونی چاہیے اس لیے ید متعین کر دیا گیا کہ وضو میں کہنیوں تک ہاتھ دھویا جائے۔

اسی اللہ نے جب چور کا ہاتھ کاٹنے کی مشکل اور دردناک سزا تجویز کی تو مسئلہ کو بالکل مبہم چھوڑ دیا؟ آخر یہاں پر اللہ تعالیٰ کو "الی الارساغ" (گٹوں تک) یا الی المرافق (کہنیوں تک) یا الی المناکب (مونڈھوں تک) کہنے میں کیا دقت تھی؟

زنان مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو متاثر کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کاٹے تھے، اس کو بھی قرآن میں "قطع ید" کہا گیا ہے اور فرعون مصر نے مومنین مصر کے ایمان لے آنے پر ان کا ہاتھ کاٹنے کی سزا تجویز کی تھی اس کو بھی "قطع ید" ہی کہا گیا ہے:

۱۔ قطعن ایدیھن (۱۲/۳۱) انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے

۲۔ لاقطعن ایدیکم (۷/۱۲۴) میں تمھارے ہاتھ کاٹوں گا

کیا زنان مصر نے اپنے ہاتھ گٹے یا کہنی یا مونڈھے سے کاٹ کر علیحدہ کر لیے تھے جس کو "قطع ید" کہا گیا؟ یا کیا فرعون مصر نے مومنین مصر کی انگلیوں میں محض خراش لگانے کا حکم دیا تھا جس کو "قطع ید" کہا گیا؟

پھر اگر "سارق" اور "سارقہ" کی سزا کے سلسلے میں "قطع ید" کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے معنی "ہاتھ کاٹنا" ہی ہیں تو یہ زنان مصر والا "قطع ید" کیوں نہ متصور ہو، لازمی طور پر فرعون مصر

والا "قطع ید" ہی کیوں قرار دیا جائے؟

چور کا ہاتھ کاٹ کر علیحدہ کیوں کیجیے، اس کی انگلیوں میں معمولی خراش لگا کر ہی اس کو کیوں نہ چھوڑ دیجیے؟ "قطع ید" وہ بھی ہوگا اور یہ بھی۔ اور اگر دونوں قطع ید پر یکساں عامل ہونے کا جذبہ ہو تو "سارق" کو فرعون مصر والے "قطع ید" کی سزا دیجیے اور "سارقہ" کو زنانِ مصر والے "قطع ید" کی۔ اللہ کی رحمت ہو علامہ اقبال پر کہ اللہ تعالیٰ سے خوب فرما گئے ہیں:

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پا زند

اور واقعی علامہ ابوالکلام آزاد نے صحیح فرمایا ہے کہ لوگوں نے:

"جب دیکھا کہ وہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اتار لیں کہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔"

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے الفاظ کی تشریح میں تمام نظائر کی چھان بین کی جاتی ہے مگر قرآن کو اس قدر لسیت سمجھا گیا ہے کہ اس سلسلے میں کسی فکر و نظر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔

چوری کے سلسلے میں "قطع ید" اپنے لغوی معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ محاورۃً استعمال ہوا ہے جیسے ہم آپ بھی مجبوری کے موقعے پر محاورۃً بولتے ہیں کہ اب تو ہم اپنا ہاتھ کاٹ چکے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

لا تجعل یدك مغلولة الیٰ عنقك (۱۷/۲۹) تم اپنا ہاتھ اپنی گردن سے ہرگز نہ باندھ لینا

کیا اس کا مطلب واقعی اپنے ہاتھ کو رسی یا تار سے گردن کے ساتھ باندھ لینا ہے۔ یا یہ محاورۃً فرمایا گیا ہے اور مطلب بخالت ہے؟ اب اگر یہاں "غل ید" کا مطلب واقعی ہاتھ باندھنا نہیں تو وہاں "قطع ید" کا مطلب واقعی ہاتھ کاٹنا کیوں ہو؟

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے اس وقت نکال کر لے جاؤ:

بقطع من اللیل (۱۱/۸۱) جب کچھ رات کٹ جائے۔

رات کٹنا خود ہم لوگوں کا محاورہ ہے ورنہ رات کوئی چیز نہیں جو کاٹی جائے۔ اب اگر یہاں "قطع لیل" کا مطلب واقعی رات کو کاٹنا نہیں تو وہاں "قطع ید" کا مطلب واقعی ہاتھ کاٹنا کیوں ہو؟

حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ:

تقطعون السبیل (۲۹/۲۹) تم لوگوں کی راہیں کاٹتے ہو

کیا وہ لوگ واقعی کسی سڑک یا راستے کو کدال یا پھاوڑے سے کاٹتے تھے یا ایسا محاورۃً کہا گیا ہے اور مطلب یہ تھا کہ لوگوں کو راستوں میں لوٹتے ہو؟ اب اگر یہاں "قطع سبیل" کا مطلب واقعی راستے کو کاٹنا نہیں تو وہاں "قطع ید" کا مطلب واقعی ہاتھ کو کاٹنا کیوں ہو؟

سورۂ لہب میں ہے کہ:

تبت یدا ابی لہب (۱۱۱/۱) ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ

کیا واقعی ابولہب کا ہاتھ کہیں پر سے ٹوٹ گیا تھا یا ایسا محاورۃً فرمایا گیا ہے، اور مطلب اس کا زور ٹوٹنا ہے؟ اب اگر یہاں "تب ید" کا مطلب واقعی ہاتھ کا ٹوٹنا نہیں تو وہاں "قطع ید" کا مطلب واقعی ہاتھ کا کاٹنا کیوں ہو؟

عاد و ثمود کے ذکر میں ہے کہ:

فردوا ایدیھم فی افواھھم (۱۴/۹) سو انھوں نے ان پیغمبروں کے منہ میں اپنے ہاتھ دے دیے تھے۔

کیا واقعی ان لوگوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کے مونھوں میں ہاتھ دے دے دیے تھے یا ایسا محاورۃً کہا گیا ہے اور مطلب ان کو مجبور کر کے خاموش کر دینا ہے؟ اب اگر یہاں "ردید" کا مطلب واقعی منہ میں ہاتھ دینا نہیں تو وہاں "قطع ید" کا مطلب واقعی ہاتھ کاٹنا کیوں ہو؟

کفار کے ذکر میں ہے کہ:

لاخذنا منه بالیمین ۝ ثم لقطعنا منه الوتین ۝ (۶۹/۴۵-۴۶)
تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے، پھر ہم ان کی رگِ دل کاٹ ڈالتے۔

کیا اللہ واقعی ان کا ہاتھ پکڑتا یا حقیقتاً کسی چاقو یا چھری سے ان کی رگ دل کاٹتا یا ایسا محاورۃً کہا گیا ہے اور مطلب ان کی گرفت کرنا اور انھیں برباد کر دینا ہے؟ اب اگر یہاں "اخذ یمین" کا مطلب واقعی دایاں ہاتھ پکڑنا اور "قطع وتین" کا مطلب واقعی رگ کاٹنا نہیں تو وہاں "قطع ید" کا مطلب واقعی ہاتھ کاٹنا کیوں ہو؟

قدیم اقوام و ملل کے ذکر میں ہے:

قطعنا دابر الذین کذبوا بآیٰتنا (۷/۷۲)
ہم نے ان کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے میری آیات کی تکذیب کی تھی۔

کیا واقعی مکذبین کی درخت کی سی کوئی جڑ تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے کسی اوزار سے کاٹا تھا یا ایسا محاورۃً فرمایا گیا ہے اور مطلب انھیں مطلقاً ختم کر دینا ہے؟ اب اگر یہاں "قطع دبر" کا مطلب واقعی جڑ کاٹنا نہیں تو وہاں "قطع ید" کا مطلب واقعی ہاتھ کاٹنا کیوں ہو؟

آپ نے دیکھا کہ یہ سارے جملے قرآن کے ہیں اور ان میں وارد الفاظ اپنے لغوی معنی میں نہیں استعمال ہوئے بلکہ وہ الفاظ محاورۃً بولے گئے ہیں پھر "قطع ید" کے لغوی معنی مراد لینا کیونکر صحیح ہو سکتے ہیں؟ نہ "ید" کا مطلب قرآن میں ہر جگہ "ہاتھ" ہی ہے اور نہ "قطع" کے معنی "کاٹنا" ہی "ید" بمعنی قوت و قدرت اور اختیار و ملکیت بھی بہت جگہ استعمال ہوا ہے:

والسمآء بنینٰھا باید (۵۱/۴۷)
اور ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا ہے

حضرات ابراہیم، اسحٰق، یعقوب اور داؤد علیہم السلام پیغمبر بھی تھے اور صاحب اختیار و ملکیت حکمران بھی اس لیے ان کو "صاحب ید" کہا گیا ہے ورنہ کون پیغمبر تھا جس کو ہاتھ نہ تھے کہ ان ہی چاروں کو "صاحب ید" کہا گیا۔

۱. ابراھیم و اسحٰق و یعقوب اولی الایدی (۳۸/۴۵)
ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب صاحب قدرت و

اختیار تھے۔

۲۔ داؤد ذالاید (۳۸/۱۷) صاحب قدرت واختیار داؤد

لہذا "ید" سے ہاتھ اور صرف ہاتھ مراد نہ لیجیے اس کا مطلب اختیار اور قدرت بھی ہے۔ اسی طرح "قطع" کے معنی بھی صرف "کاٹنا" ہی نہیں "روکنا" بھی ہے۔ کتابوں سے گنڈہ تعویذ کا کام لینے کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اگر واقعی ایسا ہوتا کہ کسی کتاب سے یہ کام لیا جا سکتا تو۔

قطعت بہ الارض (۱۳/۳۱) اس کے ذریعہ بھی زمین کی گردش روک لی جاتی۔

پھر "قطع ید" کے معنی "ہاتھ کاٹنا" ہی کیوں ہو اور "اختیار روکنا" کیوں نہیں؟

یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہم انسانوں سے ہم انسانوں ہی کی زبان میں گفتگو کی ہے اور ہمیں جو کچھ بتایا اور سمجھایا ہے وہ ہماری ہی بولی میں بتایا اور سمجھایا ہے۔ لہذا چور کی سزا میں "قطع ید" اسی محاورہ اور بول میں استعمال ہوا ہے جس میں ہم لوگ "ہاتھ کاٹنا" بولتے اور کہتے ہیں، یعنے مجبور اور بے اختیار ہو جانا۔ روک لگ جانا۔ بے بس ہو جانا۔ جسماً نہیں بلکہ عملاً۔

قرآن نے ہاتھ کاٹنے کی سزا ضرور مقرر کی ہے مگر "چور" کی نہیں بلکہ "باغیوں" اور "بدامنی پھیلانے والوں" کی:

انما جزآء الذین یحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض (۵/۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں یا ملک میں بدامنی برپا کریں ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا ان کو پھانسی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹ ڈالے جائیں یا ان کو جلاوطن کر دیا جائے۔

غور فرمایئے کہ "ہاتھ کاٹنا" کوئی معمولی سزا نہیں کہ معمولی جرم پر کسی کو دی جائے۔ اللہ تعالیٰ

نے ہاتھ کاٹنے کی سزا کو قتل، پھانسی اور جلا وطنی کی سخت سزاؤں کا متبادل ظاہر کیا ہے، اور یہ سزائیں ان کے لیے تجویز کیا ہے جو اسٹیٹ سے جنگ کریں یا ملک میں بغاوت و بدامنی برپا کریں۔ پھر کیا اسی اللہ نے ہاتھ کاٹنے کی سزا ان کی بھی تجویز کر دی جو چوری کریں؟ گویا "بغاوت" اور "بدامنی پھیلانا" اور "چوری" یکساں جرم ہیں؟ حالانکہ قرآن نے "قتل" کو بھاری گناہ اور "فتنہ انگیزی" کو قتل سے بھی بڑا گناہ قرار دیا ہے:

۱۔ الفتنة اشد من القتل (۲/۱۹۰) فتنہ انگیزی قتل سے بھی سخت جرم ہے

۲۔ الفتنة اکبر من القتل (۲/۲۱۵) فتنہ انگیزی قتل سے بھی بڑا جرم ہے

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ "چور" کی بھی وہی سزا مقرر کرے جو اس نے باغی و فسادی کی مقرر کی ہے؟

یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ چونکہ ہاتھ کاٹنے کی سزا بھاری سزا ہے اور زندہ رہنے کی صورت میں اس سے انسان نیکیوں سے بھی محروم ہو سکتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے بغاوت و بدامنی پھیلانے والے عظیم جرموں کی سزا میں "جلا وطنی" کی سزا کو بھی شامل کر کے مجرم باغی اور فسادی کے جسمانی سزا سے بچ جانے کی راہ نکال دی ہے۔ یعنی اگر وہ قتل ہو گیا یا پھانسی پڑ گئی تو بات ہی ختم ہو گئی مگر اگر اسے زندہ رہنا ہے تو ہاتھ سے مجبور نہ ہو بلکہ ملک سے باہر نکل جائے۔ بھلا جس رحمٰن و رحیم اللہ تعالیٰ نے باغی اور فسادی تک کے لیے یہ رعایت دی ہو۔ وہی اللہ چور کو کوئی رعایت نہیں دیتا اور بس ایک ہی حکم دیتا ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ ڈالو! تب تو گویا "چوری" بغاوت و بدامنی پیدا کرنے سے بھی بڑا جرم ہو گیا۔ حالانکہ ایسا کوئی صحیح الدماغ شخص نہیں سمجھ سکتا۔

قرآن نے "چور" کی سزا ہاتھ کاٹنا ہرگز مقرر نہیں کی ہے۔ اگر ایسے معمولی جرم پر اللہ تعالیٰ کو ایسی کڑی اور بے رحمانہ سزا دینی ہوتی تو وہ یقیناً زانیوں کی سزا ان کا خصی کرنا

اور جھوٹوں کی سزا ان کی زبان کاٹنا قرار دیتا تاکہ آئندہ وہ یہ جرم نہ کر سکیں۔ نیز اگر واقعی اللہ کی مرضی ہوتی کہ چور کو ایسی سخت سزا دی جائے تو یقیناً وہ یہاں پر نہ صرف یہ واضح کر دیتا کہ یہ "قطع ید" زمانِ مصر والا ہوگا یا فرعون مصر والا؟ بلکہ یہیں پر وہ تمام وضاحتیں بھی موجود ہوتیں جن کا لازماً موجود ہونا اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

دراصل یہاں "قطع ید" محاورۃً استعمال ہوا ہے جس کا مطلب چور کو بے اختیار کر کے چوری سے مجبور کر دینا اور اصلاح حال کے مواقع بہم پہنچانا ہے۔ جس طرح ہم لوگ اپنے معاملات میں مجبور و بے اختیار ہو جانے پر بولتے ہیں کہ اب تو ہم اپنا ہاتھ کاٹ چکے، اور چور کو چوری سے مجبور کرنے یا "قطع ید" کا حکم یا عمل محض چور کو جیل میں بند کر دینے سے قرار واقعی پورا ہو جائے گا۔ چاہے اس قید کی میعاد حسب حال یا حسب ضرورت چند دن ہو یا چند مہینہ یا چند برس۔ اور یہی ہوگا:

جزآءً بما کسبا نکالاً من اللہ — یہ ان کے جرم کی سزا ہے اللہ کی طرف سے بطور روک کے۔

جیل میں بند کر دینے سے نہ صرف چور کو چوری کرنے کا موقع نہ ملے گا اور وہ اس سے رک جائے گا بلکہ اس قید و بند میں اس کو اپنی اصلاح کا بھی موقع ملے گا۔ "انکیل" سخت بیڑی کو کہتے ہیں۔ مکذبین کی سزا کے ذکر میں ہے کہ:

ان لدینا انکالاً و جحیماً (۷۳/۱۲) — ہمارے یہاں ان کے لیے سخت بیڑیاں ہیں اور دوزخ۔"

بیڑی جس انسان کو پہنائی جاتی ہے تو اسے یا تو پاگل خانہ میں رکھا جاتا ہے یا جیل خانہ میں۔ مکذبین کو بھی جب بیڑی پہنائی جائے گی تو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ یہی "نکالاً من اللہ" ہوگا۔ یعنی اللہ کی طرف سے روک۔

اس طور پر چور کی سزا ہاتھ کاٹنا نہیں بلکہ قید کرنا ہے۔ مصری حکومت کے سرکاری عالم نے

پسرانِ یعقوب علیہ السلام سے جب بنیامین کی چوری اور اس کی سزا کے بارے میں دریافت کیا تھا کہ کیا ہونا چاہیے؟ تو ان لوگوں نے کہا تھا کہ:

فھو جزآؤہ کذٰلک نجزی الظٰلمین (۱۲/۷۵) — وہ شخص اپنی سزا آپ ہے۔ ہم لوگ تو ظالموں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔

چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو یہی سزا دی تھی۔ انھیں مصر میں روک لیا تھا اور گھر جانے کی آزادی سلب کرلی تھی اور یہی جیل کا مفہوم و مقصد ہے۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ چونکہ مشیت الٰہی کے تحت وہ "چوری" نمائشی تھی اس لیے یہ "قید" بھی نمائشی تھی، اور وہ شاہی محل میں بطور مہمان رکھے گئے تھے۔ اگر بنیامین نے واقعی چوری کی ہوتی تو انھیں مصری جیل خانہ میں محبوس کیا جاتا۔

اس طور پر جس طرح قرآن نے یہ اشارہ کردیا ہے کہ غلہ ناپنے کا حقیر پیمانہ تک چرانے والا "چور" ہی کہلائے گا، اسی طرح یہ بھی بتا دیا ہے کہ "چور" کی سزا "جیل" ہوگی۔ یہی ہوگا "قطع ید" یعنی اس کو محبوس کرکے اس فعل سے روک دینا اور مجبور و بے اختیار بنا کے قید و تنہائی میں اصلاح کا موقع دینا۔

آپ غور کریں گے تو دیکھیں گے کہ قرآن نے بہت سے جرائم اور ان کی سزاؤں کا ذکر کیا ہے مگر کسی اور جرم کی سزا "قید" نہیں بیان ہوئی ہے۔ اسی لیے "جزاء بما کسبا نکالاً" کا جملہ اور کسی جرم و سزا کے سلسلے میں وارد نہیں ہوا۔ کیونکہ "چوری" کی سزا "قید" ہوگی اور میعاد سزا امیر یا اس کا قائم مقام جج جرم و شہادت کے پیش نظر اپنی صوابدید سے متعین کرے گا اور جیسا جرم ہوگا ویسی میعاد سزا تجویز کرے گا۔ اور اگر چور اس جرم سے توبہ و استغفار کرے گا تو وہ رہا بھی کیا جاسکے گا۔ اسی لیے آگے فرمایا کہ:

فمن تاب من بعد ظلمہ واصلح فان اللہ یتوب علیہ ان اللہ غفور رحیم — سو جو شخص توبہ کرے اس ظلم کے بعد اور اپنی اصلاح پر آمادہ ہو تو بے شک اللہ اس کی توبہ

الم تعلم ان اللہ لہ ملک السموات والارض یعذب من یشآء و یغفر لمن یشآء و اللہ علی کل شیء قدیر ۵ (۵:۴۰)

کیا تم نہیں جانتے کہ یہ تمام آسمان و زمین اللہ کی حکومت میں ہیں اور وہ جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کر دے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قبول کرے گا۔ واقعی اللہ بڑا غفور رحیم ہے

سوچیے کہ چوری کے سلسلے میں یہ سب لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر چور کا ہاتھ کاٹ ہی دیا جائے گا تو "توبہ" اور اس کی "قبولیت" یا "اصلاح" اور "معافی" وغیرہ کا کیا سوال پیدا ہوتا یا ہو سکتا ہے؟ ایک اور بات قابل خیال یہ ہے کہ پسران یعقوب علیہ السلام نے چور کے لیے "ظالم" کا لفظ استعمال کیا تھا اور یہاں بھی چوری کے لیے "ظلم" ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کی معافی و اصلاح کا ذکر ہوا ہے۔ لہذا از روئے قرآن چور کی سزا سوائے قید و حبس کے دوسری کوئی ہو ہی نہیں سکتی اور اگر چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی تو وہ خدائی سزا نہیں بلکہ فرعونی سزا متصور ہو گی۔

خدا نے ہاتھ کاٹنے کی سزا باغی و فسادی کے لیے اور صرف بغاوت و فساد انگیزی کرنے والے کے لیے مقرر کی ہے بشرطیکہ وہ بھی ملک میں رہے یا رکھا جائے اور اگر جلا وطن ہو جائے یا کیا جائے تو وہ بھی اس سزا سے محفوظ رہ سکتا ہے۔